Research Journal
Tahqeeqat
eISSN: 2791-0342
pISSN: 2791-0334
ریسرچ جرنل
تحقیقات

توصیف تبسّم کی نظم کا وجودی تناظر

The Existential Perspective of the Poem of Tauseef Tabassum

Shoaib Ur Rahman
MPhil Scholar Riphah International University Faisalabad Campus
Prof Dr Muhammad Asif Awan
Director Advance Studies Riphah University Faisalabad Campus

شعیب الرحمٰن
ایم فل اسکالر رفاہ انٹر نیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد کیمپس
پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان
ڈائریکٹر ایڈوانس سٹڈیز رفاہ انٹر نیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد کیمپس

Abstract

This study attempts to read Dr. Tauseef tabassum's poem in the context of the poem after 1960. At that time Urdu poem was compared with the tradition of international poem. In the nineteenth century, Kirkgaard questioned the meaning of human life and its meaning in the twentieth century, the wisdom was kept on the status of a manifestation and the existence was kept in front of it. The answers to the bible, science and philosophy remained insufficient for the physical status of the existence. Tauseef tabassum is counted in the modern literature of Pakistan. He was in adolescence at the time of the partition of the colonists, cutting off the difficulties of emigration with the family, saving the child reached rawalpindi, settled here and died in Islamabad. Your personal experience is related to teaching. Tauseef tabassum's poem has the dimension of self and self-exploration due to individual's autonomy and independence. That's why his poems have deep and wide canvas. He took the task of searching for caste from object but in his statement internal passion is attached to individual's autonomy and freedom. The search for the status of the individual beyond the manifestation is found in the search for the knowledge of annihilation. These are the questions of his poem, what is man? What is the meaning of individual What is the form of liberty and autonomy of the imprisoned person in phenomena.

Keywords: *Existentialism, Subjective Analysis, Modern Poem, Feelings, Finitude, inwardness subjective, Materialism, Phenomenalogy, Being and Nothi ngness.*

کلیدی الفاظ: وجودیت، موضوعی تجزیہ، جدید نظم، احساس، محدودیت، داخلی موضوع، مادیت، ہستی اور لاشیئیت

سترھویں صدی میں ڈیکارٹ کا انسانی وجود کے متعلق فلسفہ دوئیت مقبولِ عام ہوا، اس کے مطابق انسانی وجود مادہ اور شعور کا مرکب ہے۔ اس نے مادی وجودوں کے مقابلے میں انسانی وجود اضافی قرار دیا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہر مادی وجود کو مادہ اور شعور کا مرکب کہا گیا لیکن انسانی وجود کے علاوہ تمام اشیا کی شعوری حالت خوابیدہ تسلیم کی گئی۔ سائنسی ترقی نے انسان کے عقیدوں، امیدوں اور جذبوں کو متاثر کیا۔ سائنس پرستی کے اس دور میں جب کہ سائنس بہت سے مسائل کا حل بآسانی مہیا کرنے لگی تھی؛ اسے مذہب کی حیثیت ملنے لگی، دوسری جنگِ عظیم سے سائنسی ایجادات میں بحران پیدا ہوا۔ جس نے فرد کے داخلی احساسات میں خلل پیدا کیا۔ چوں کہ عقل پرستی کی جڑیں موجود تھیں اس لیے ایک گروہ سائنس کے امتیاز کو قبول کرتے ہوئے لسانی مغالطوں کی درستی سے قائم ہوا جب کہ دوسرا انسانی وجود کی کاملیت کے بیانیے کے ساتھ نطشے کے انسان کی انفرادی خود مختاری کو موضوعِ بحث لایا اور تجریدی، منطقی اور سائنسی فلسفے کی نفی کی۔ انیسویں صدی میں کیرکگارڈ نے انسانی زندگی اور اس کے معنی کے سوال کیے۔ بیسویں صدی میں عقل کو مظہر کی

حیثیت پر رکھا اور وجود کو مقدم رکھا گیا۔ اس ضمن میں ۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۰ء کی دہائیوں کے فرانسیسی فلاسفہ ژاں پال سارتر، سیمون دی بووار اور البرٹ کاموس کے نام نمایاں ہوئے۔ بائبل، سائنس اور فلسفہ کے جوابات وجود کے طبیعیاتی حیثیت کے لیے ناکافی رہے تو وجودیوں نے وجود کو ہمواریت کے پیمانے سے دیکھا۔ ان کے پیش نظر انسانی وجود ہی زیادہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ وجودیت کی تحریک میں خدا کے وجود کی موت کے انکاری اور قائل بھی ملتے ہیں لیکن ان کا بنیادی سوال فرد کے انفرادی رجحانات، جذبات، ذہنی احساسات ہی رہتا ہے:

"عام طور پر تمام وجودیت پسندوں کے افکار میں یہ بات مشترک نظر آتی ہے کہ ان کے اقدار کی بنیاد فرد کی نجی ایجاب و ارتکاب، آزادی انتخابی، خود مختاری اور آزادی عمل پر موقوف ہے۔"(1)

وجودیوں نے منتخب و معتبر اشخاص کا اجتماعی تاثر توڑا اور فرد کی فطری آزادی کی سوچ نے جنم لیا۔ انھوں نے انفرادیت، تجربے اور عصری حسیّت کے روابط کا ہونا اہم قرار دیا۔

وجودیت نے انسانی اجتماعی سوچ اور تاثر کو فرد کی موت قرار دیا اور کہا انسان کی اہمیت اور موجودیت اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اپنی انفرادی شناخت قائم کرے۔ انسان کی حیثیت آج کی دنیا میں کیا ہے؟ انسان کیا کر سکتا ہے؟ اس کا اختیار کس قدر ہے؟ یہ ہر فرد کے لیے الگ جواب رکھنے والے سوال ہیں۔ خواہ وہ ایک نسل، گروہ، قبیلہ، خاندان سے ہی کیوں نہ ہوں؛ وراثتی اور جینیاتی مماثلت میں تسلسل ہو، اُسے وجودی اختیار کی بقا کے لیے ان سوالوں کے جواب، معیاری اور انفرادی مقام پر قائم کرنے ہیں جب کہ ان سوالوں کے جوابات ماضی کے تجربے سے اُس کے سامنے ہوتے ہیں، جسے وہ حال اور مستقبل سے جوڑتا ہے:

"وہ لوگ جو گروہی دباؤ اور اثرات کے زیر اثر اپنے معتبر وجود کو دریافت کیے بغیر عمومی سطح پہ زندگی بسر کر رہے ہیں، زندہ تو ہیں لیکن ان کا 'وجود' نہیں ہے۔"(2)

انسان اب بھی ایسے گروہوں میں آباد ہیں جہاں انسان کی وجودی ترقی معاشرتی، سماجی، وراثتی اور جینیاتی مماثلت میں جکڑی ہوئی ہے۔ یہ مماثلت سماجی قاعدوں سے بھی بنتی ہے جو اس معاشرے اور نسل کی سوچ اور تاثر میں اجتماعیت رکھتی ہے، کیا یہ گروہ مادی وجود کے حامل نہیں؟ ایسا نہیں ہے، لیکن اُن کا شعور خوابیدہ حالت میں ہے جب کہ وجودیوں کے ہاں وجود، اجتماعی معتبرات سے انفرادی اعتبار کا حامل ہوتا ہے۔ ایک نامعتبر شخص بھی داخلی رجحانات اور احساسات سے کام لیتا ہے۔ کیا نامعتبر بھی معتبر ہو سکتا ہے؟، وجودیوں نے اس کے جواب میں عقلی مفروضات اور سائنسی تجربات کو بے بس کر کے پیش کیا:

"کانٹ نے دو صدیوں پہلے کہا تھا کہ عقل تمام چیزوں کا احاطہ نہیں کر سکتی۔"(3)

وجودی اعتبار سائنسی اور عقلی سوالوں سے بھی جواب نہیں پاتا بلکہ فرد کے گرد کے واقعات اسی سے وابستہ اور عبث ہیں کیوں کہ ان کے رونما ہونے میں فرد کے ذاتی فیصلے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں جو سائنسی و عقلی میلان نہیں رکھتے۔ انسانی عقل مظہر پر غور و فکر کرتی ہے مگر مظہر سے پرے کے سوالات کے جوابات مہیا نہیں کرتی لیکن انسان اپنی ذات سے پرے جانا چاہتا ہے۔ غیر عقلی و غیر منطقی معجزات کا

ہونا انسانی تاریخ کا نمایاں پہلو ہے۔ سائنس فرد کے احساسات اور اختیارات کو لیباٹری میں نہیں جانچ سکتی۔ وجودیت کے ان کاٹ دار سوالوں نے عقلی اور سائنسی میدان میں ہونے والے عجائبات کو نامکمل قرار دیا۔ وجودیوں کے ہاں مابعد الطبیعیاتی مسائل کے ضمن میں فرد کا وجود کئی حوالوں سے زیر بحث لایا گیا۔

اس نقطۂ فکر کو جلد ہی صنعتی، مارکسی، جدلیاتی، سائنسی اور عقلی دیواروں میں مقید کر دیا گیا لیکن اس فلسفے نے ادبی افکار میں بھرپور جگہ بنائی ہے۔ وجودیوں نے ترغیب کے اظہار میں زبان و بیان کو خاص اہمیت دی۔ زبان سے ابدی صداقتوں کا بیان مافی الضمیر حقیقت پر مبنی ہونا چاہیے کیوں کہ یہ ہمارے جذبے اور احساس کی ترجمان ہوتی ہے۔

مابعد نو آبادکاری انڈو پاک میں ذرائع ابلاغ، جدید فنّی علوم، صنعت و ٹیکنالوجی کی سہولت نے یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی متاثر کیا اور اسے جدید ادب کا نام دیا جاتا ہے۔ ناصر عباس نیّر نے جدیدیت کی فکری اساس میں وجویت کو لازم قرار دیا۔[4] اُردو میں 1960ء سے اُردو نظم کے ایسوں کو سراہا گیا جنھوں نے اُردو زبان و ادب کی انفرادی سالمیت، معیار و مقام پر قائم رکھی۔ اُن نظم نگاروں میں جدید فکر و فن کا الگ راستا ہے۔ نظم نگار خارجی مظہر کا سہارا لیتا بھی ہے تو داخلی جذبے کی وقعت کو بیان کرتا ہے۔ فرد کی حقیقت کو غیر منطقی انداز سے گہرے داخلی احساسات کو سامنے لانا، نظم نگار کو جہاں خود مختاری دیتی ہے وہاں اپنی الگ شناخت کا اعتبار بھی قائم کرتی ہے۔ وجودی نظریے کی اس فکر کو اُردو نظم میں معتبر آواز و بیان دینے میں مجید امجد کا نام سرفہرست ہے۔ میرؔاجی اور ن۔ م راشد کے علامتی سہارے معنی کی خود مختاری کی عمدہ مثال ہے۔ وجودی حوالوں کے ضمن میں توصیفؔ تبسم کی نظم بھی اعتبار کا درجہ رکھتی ہے۔ جدید ادب کی جدید نظم اس فلسفے کی جہتوں کو اپناتی ہے۔

محمد احمد توصیف تبسم (۳/ اگست ۱۹۲۸ء-۵۔ اکتوبر ۲۰۲۳ء) کا شمار پاکستان کے جدید شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ "کوئی اور ستارہ" نظموں اور غزلوں کا انتخاب ہے۔ آپ کا شعری قالب فطری آہنگ سے مربوط ہونے کی وجہ سے جدید اسلوب کا حامل ہے۔ آپ کی زندگی ہی میں منتخب کلیات "آسماں تہِ آب" چھپ چکی ہے۔ توصیف تبسم کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو تمام عمر شہرت اور نام وری کے ہر حربے سے دور رہے ہیں۔ توصیف تبسم نو آبادکاروں کی تقسیم کے وقت نوجوانی ہی میں تھے، اہلِ خانہ کے ساتھ ہجرت کی صعوبتیں کاٹتے، بچتے بچاتے راولپنڈی پہنچے، یہیں سکونت اختیار کی اور اسلام آباد میں وفات پائی۔ آپ کا شخصی تجربہ درس و تدریس سے وابستہ ہے۔ آپ کے ہم عصروں میں آفتاب اقبال شمیمؔ (متوفی: ۲۶۔ جولائی ۲۰۲۴ء) افتخار عارفؔ، طارق نعیمؔ اور وحید احمدؔ وغیرہ شامل ہیں۔

توصیف تبسم کی نظم میں فرد کی خود مختاری اور آزادی کے سبب خود اور ذات کی تلاش کی جہت ہے۔ اسی سبب اُن کی نظمیں گہرا اور وسیع کینوس رکھتی ہیں۔ انھوں نے مظہر سے ذات کی تلاش کا کام لیا مگر اس کے بیان میں داخلی جذبہ فرد کی خود مختاری اور آزادی سے منسلک ہے۔ فرد کی مظہر سے پرے کی حیثیت تلاشنے کو مابعد الطبیعیاتی، غائر اور عمیق احساس کے سبب فنا و ابد کی معرفت کی تلاش پائی جاتی ہے۔ غائر تنہائی کے باوجود، اُن کی نظم کی فضا انانیت و رجائیت کے سبب ایک مکمل فرد کا آزاد منظر پیش کرتی ہیں۔ اُن کی نظم، انسان کیا ہے؟ فرد کی معنویت کیا ہے؟ مظاہر کی سمت اور مظاہر میں قید فرد کی آزادی و خود مختاری کی کیا صورت ہے؟ کے سوالوں کی حامل ہے:

پردہ مری آنکھ سے اٹھادے! میں کون ہوں یہ مجھے بتادے![5]

صالح وجود کی تلاش:

وجودی فکر کا حامل نظم نگار اخلاقی معیاروں پر قائم ایک صاف اور واضح جستجو کرتا ہے۔ وجودی عقیدہ اور الحاد کی تقسیم کی وجہ سے اخلاقی معیارات کو عالم گیر نہیں جانتے بلکہ ہر فرد کے انفرادی انتخاب کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ تاہم اس دنیا میں صالح وجود کی حیثیت یقین سے جڑی ہے۔ انسانی وجود اس دنیا میں دوسری مادی وجودوں کی طرح نہیں، صالح وجود، دوسرے دجودوں میں پہچان اور معیار بناتا ہے ،وجود کی محدودیت سے نکل کر عمل اور فیصلے کی خود مختاری اور آزادی کے باوجود 'موت' کی قطعیت کا یقین رکھتا ہے۔ توصیف تبسم کی نظم پہچان اور معیار میں جدیدیت سے ہم آہنگ ایک ایسے وجود کو تراشتی ہے جو بے ثباتی کی محرومیوں کے سامنے زندگی کے معانی تراشتا ہے۔ "ہم زاد" کا آخری بند دیکھیے:

یہ قصرِ ماہ، یہ تارے، یہ راہِ کاہکشاں
اگر نظر ہو فروزاں تو ہر فراز ہے پست
"بلند تر ز شپ ہر است منزلِ من و تُو
براہِ قافلہ، خورشید میلِ فرسنگ است۔"[6]

اس ضمن میں نظم "تناظر" اہمیت کی حامل ہے۔ نظم نگار مظاہر کے تناظر میں ایسے وجود کو سامنے لاتا ہے جو خوشبوؤں کا پیغام، اندھیروں میں چراغوں کا احوال اور راستوں کے مناظر کا اثبات لیے ہوئے ہے۔ نظم "فن" میں وجود کے کے مظاہر اور فطرتی مظاہر کی فنا کا یقین کامل ہے اور اسی سے وجودی مظہر کی بقا عظمت قائم رہنے کا بیانیہ رکھتے ہیں۔

عدم وثبات کے مسائل

لاشیئیت کا مسئلہ وجدویوں کے ہاں تواتر سے اہمیت رکھتا ہے۔ وجودی فکر کا ڈھانچہ اسی سیاق میں تعمیر ہوتا ہے۔ انسان ہی ہے جو موجودات کے درمیان خلا محسوس کرتا ہے۔ انسان زندگی میں اٹھنے والے ایسے مسائل میں فرار چاہتا ہے (جیسا رویہ اُردو کے علامتیوں کے ہاں ملتا ہے) مگر وجودی نقطہ نظر اسے غیر صالح وجود قرار دیتے ہیں۔ وہ ان مسائل کا حل فکر (عقل) سے لیتا ہے جس کی حیثیت عدم کی ہے تاہم موجود وجود عدم کے برابر ہے۔ اس کے ہونے کی دلیل نہیں۔ سائنس دانوں نے اس کائنات کو ذروں میں منقسم کیا اور ایک ذرے کے انتشار سے اس کے فنا ہونے کا تصور دیا، وجودیوں کے ہاں اسی انتشار سے وجود کی اصل ماہیت طے ہوتی ہے۔

عدم کا احساس توصیف تبسم کے ذہن پر حاوی رہتا ہے۔ حقیقت خواہ کچھ بھی ہو وہ اس مادی حصار کو توڑ کر ہدایت تک رسائی چاہتے ہیں۔ فنا کا احساس انھیں ہر وقت کچھ ایسا کرنے پر اکساتا ہے جو ان کی فکر کو اس احساس سے آزاد کردے۔ مادی حد بندیوں کو توڑ کر امر ہونے کی خواہش ان کے ہاں قائم رہتی ہے۔

وہ فرد کی خود مختاری کے ہوتے ہوئے جبر و قدر دونوں کی موجودگی کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک انسان مجبور محض ہے وہ نادیدہ جکڑ بندیوں کے آگے بے بس ہے۔ وہ ایک نظم میں حیات انساں کی بے کسی اور دست اجل کی کارفرمائی کا اظہار بڑے تفکر آمیز پیرائے میں یوں کرتے ہیں:

ہر ضرب پہ یاں اجل کے آگے
مجبور حیات بے سپر ہے
پھیلے ہوئے کوس زندگی کے
طے کر نہ سکیں گے لوگ جیسے
مرجھائے ہوئے چمن کے پھولو!
بولو! کہ اجل کا ہاتھ کیسے
شاخوں سے اتارتا ہے ہم کو
مٹی میں سنوارتا ہے ہم کو (7)

یہاں وجود کی ابدی حیثیت واضح ہوتی ہے، توصیف تبسم گردش لیل و نہار کے سامنے خود کو بے بس محسوس کرتے ہیں۔ یہ احساس بے بسی انھیں کبھی کرب میں مبتلا کر دیتا ہے تو کبھی غور و فکر پر مائل کرتا ہے۔ نظم "کتبہ" میں ایک ایسے وجود کی تشکیل ہے جو عدم کے وجود کی جستجو اور فرد کی محدودیت اور موت کو موضوع بناتا ہے۔

مابعد الطبیعیاتی مسائل

توصیف تبسم کی نظم میں ورائے مظہر کی تصویر ملتی ہے۔ جہاں تفکر کے ساتھ تحیر کے اجزا بھی نظر آتے ہیں وہ ذات و مظہر کو اپنا خاص موضوع بناتے ہیں۔ فرد کی حیثیت جاننے کا تجسس اور اصل حقیقت تک رسائی کی تمنا فرد کو گہری فکر پر مائل رکھتی ہے۔ توصیف تبسم کے ہاں یہ فکر تخلیقی شعور کا محور قرار پاتی ہے۔

مظہر اور مظاہر کی لامحدودیت اور حیرتیں انھیں غور و فکر پر مائل رکھتی ہیں۔ یہ عناصر ان کے ہاں فکری گہرائی، وسعت اور بسا اوقات اعلیٰ تخلیقی وجدان کا باعث بنتے ہیں۔ وہ نظم تخلیق کرتے وقت ایسی فضا بناتے ہیں جو قاری کو دعوتِ فکر بھی دیتی ہے اور مابعد الطبیعیاتی عناصر سے روشناس بھی کراتی ہے ایک طرح سے یہ وجود محض ایک نقطہ نظر آتا ہے۔ حقیر، مبہم اور بے وقعت ایسے میں وہ اس عظیم قوت کی بیکراں وسعتوں کے مقابل انسانی وجود محض ایک شاعر کے طور پر متعارف کرنے کا وسیلہ بنتا ہے۔ یہاں انھیں کائنات کی بیکراں وسعتوں کے مقابل انسانی وجود محض ایک نقطہ نظر آتا ہے۔ توصیف تبسم ان نادیدہ انگلیوں کا اسرار جاننے کی تمنا سے دستبردار نہیں ہوتے جو پیہم امکان کے ورق پر نئی تحریروں کو نمایاں کر رہی ہیں۔ وہ نظم "تہہِ سنگِ آسیہ" میں اپنی حیرتوں کا اظہار یوں کرتے ہیں:

عجیب حیرت کدہ ہے دنیا!
زمیں اندھیرے میں تیرتی ہے

تو کون اس کو نشان دیتا ہے منزلوں کے
کوئی تو ہے جو چمکتے سورج کی روشنی کو
سفید رنگت سے سات رنگوں میں ڈھالتا ہے
یہ پیڑ ہونے کا خواب بھی عطا ہے اس کی
جو بیج کی آنکھ مردہ مٹی میں دیکھتی ہے
اسی کی نادیدہ انگلیاں ہیں
جو پیہم امکان کے ورق پر
نئی لکیر بنا رہی ہیں (8)

توصیف تبسم کی نظم پہلا سوال یہ اٹھاتی ہے کہ میں کون ہوں؟ یعنی انسان کیا ہے؟ انسانی وجود کیا ہے؟ یہی توصیف تبسم کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اس راز کو جاننا ان کی نظم کے وجدان کا حصہ ہے انھوں نے یہ سوال بار بار مختلف انداز میں اٹھایا ہے۔

ابد و دوام کے مسائل:

مادی وجود کے حصار کو توڑنے کی خواہش انسان میں شروع ہی سے موجود ہے مگر توصیف تبسم کے ہاں یہ تمنا ایک غالب عنصر کے طور پر موجود ہے۔ وجودی اعتبار سے ابدیت کی تمنا ان کی فکر کی مہمیز کرتی ہے اور وہ ہر جہت کو عبور کر لینے کی کوشش میں سرگرداں نظر آتی ہے مگر یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ طلسم جاں سے نکلنے کی کوئی صورت بنتی نظر بھی نہیں آتی۔

آخر تمام تگ و دو کے بعد نظم نگار کو اس بات پر سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے کہ انسان بے بس ہے۔ اس کے اختیار کی ایک حد ہے۔ یوں انھیں یہ ادراک کرنا پڑتا ہے کہ انسانی زندگی مائلِ فنا ہے۔ وہ زندگی کو ناکردہ گناہوں کی سزا قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک حال یعنی لمحہ موجود ایسا محور ہے جس کے گرد زندگی صبح و شام، رات دن کی صورت گردش کر رہی ہے۔ نظم "محور" میں یہ صورتِ حال دیکھیے:

زیست ناکردہ گناہوں کی سزا
کتنی بے رنگ ہے کس درجہ سپاٹ
حال۔۔۔ اک نقطہ نظر آغازِ سفر
کوئی جادہ، نہ نشانِ منزل!
شام ہوئی، رات ہوئی
زندگی بیت گئی! (9)

اس حقیقت کا اعتراف شاعر کے دل میں زیست کی کم مائیگی اور بے وقعتی کے احساس کو مزید گہرا کر دیتا ہے۔ لایعنیت کے نشان اسے زندگی کے ہر موڑ پر ثبت نظر آتے ہیں اور زندگی اسے ایک زخمی اور بے پر و بال پنچھی کی طرح محسوس ہوتی ہے، اڑان بھرتے ہی جس کا

مقدر حسرت و فنا ہے مگر وہ دوام کی خواہش سے پھر بھی دستبردار ہوتے نظر نہیں آتے۔ اس تناظر میں کائنات کی وسعتوں پر غور و فکر کرتے ہیں۔ نظم "تہہِ سنگِ آسیہ" میں وہ حیرتوں اور تجسس کا اظہار اس طرح کرتے ہوئے ایک یقین تک پہنچتے نظر آتے ہیں:

عجب حیرت کدہ ہے دنیا!
زمین اندھیرے میں تیرتی ہے
تو کون اس کو نشان دیتا ہے منزلوں کے!
کوئی تو ہے جو چمکتے سورج کی روشنی کو
سفید رنگت سے، سات رنگوں میں ڈھالتا ہے(10)

ہمیشگی کی تمنا فرد کی سطح پر نہیں بلکہ پوری انسانی صورت حال کے حوالے سے ان کی شاعری میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ مظاہر کائنات کو بھی وہ اس کا حصہ تصور کرتے ہیں یوں ان کی اصولِ حیات کا ابدی استعارہ بنتی نظر آتی ہے۔ اس منظر میں نظم نگار کا خود کو تلاشنے اور خود پر یقین اور کامل اختیار کا غیر حقیقت پسندانہ رویہ سامنے آتا ہے۔ جو فرد کی آزادی اور خود مختاری میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ کامل یقین فرد میں انانیت سے الگ ہو کر ممکن نہیں ہو سکتا۔ نظم "تناظر" میں ملاحظہ کیجیے کہ یہ صورت حال خود کو فطرت کے ساتھ متحد کرتی نظر آتی ہے:

اردگرد، چاروں سمت
جیسے میں ہی بکھرا ہوں
جیسے جسم پر میرے
موسموں کی یورش ہو
کوہ میرا چہرا ہے
ندیاں میرے بازو
جھیل میری آنکھیں ہیں
سیر کے تناظر میں
خود کو دیکھتا ہوں میں(11)

توصیف تبسم کے ہاں یہ رویہ عموماً ملتا ہے۔ وہ مظہر کی موجودگی میں خود کی تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ مظہر کی موجودگی اُنھیں فرد کی حیثیت وضع کرنے میں مدد دیتی ہے۔

رجائی و انائی اعتبار

نظم نگار کو گو کر دوپیش میں حوصلہ شکن حالات کا سامنا رہتا ہے۔ زندگی کے پے در پے مصائب و آلام اس کے حوصلہ کو توڑتے ہیں مگر جلد سنبھل جاتا ہے اور نا امیدی کی صورت حال میں بھی امید کا جگنو انھیں ڈھارس دیتا ہے۔ وہ قاری کو مایوسی و نا امیدی کی بھینٹ نہیں

چڑھنے دیتا بلکہ وہ ہر طرح کے صبر آزما حالات میں بھی امید کا دامن تھامے رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم میں رجائی لہجہ نمایاں ہے۔

حالات کی تمام تر سنگینی بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں لاتی۔ وہ شدید رنج والم میں بھی صبر و استقلال کا دامن نہیں چھوڑتا، رجائیت اس کے لہجے میں نمایاں رہتی ہے۔ وہ انسان کو خاکی وجود کی جکڑ بندیوں سے اوپر اٹھ کر تیرگی میں خود کو ایک روشن ستارا بننے پر اکساتا ہے۔ نظم "زمستان کی آخری رات" دیکھیے، جہاں فرد کو اپنے پوشیدہ کمالات کو اجالنے کی ترغیب دیتا ہے:

تیری پیشانی
تیری مردہ امنگوں کی لحد کا کتبہ
درد کی ٹھہری ہوئی لہر، لب پیوستہ
کس طرح دیکھوں کہ دیکھا نہیں جاتا مجھ سے
تو اگر خاک کی پستی سے ابھر کر سوچے،
خود ستارہ ہے، ستاروں کی تمنا میں بھٹکنے والے!(12)

ان حالات میں نظم نگار ہمت سے کام لیتا ہے اور امید پر قائم رہتا ہے۔ جہدِ مسلسل اور پختہ یقین کی بنا پر پستی کو بلندی کا استعارہ بناتا ہے اور تاریکی کو روشنی کا پیامبر کرتا ہے۔ وہ منتظر رہتا ہے کہ کب سبز مہکتے پتوں سے امید کے شجر پر بہار آئے اور زندگی اپنے تمام تر حسن کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ نظم "آخر شب" کا یہ انداز دیکھیے:

جانے کب شب کی بے حسی ٹوٹے
جانے کب، یک بیک سحر ہو جائے
حسن انگڑائی لے کے جاگ اٹھے(13)

توصیف تبسم حساس طبع اور بیدار شعور کے حامل شاعر ہیں۔ ان کے ہاں دروں بینی بڑھ کر انانیت کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ یہ رویہ ان کی غزل و نظم دونوں میں نمایاں ہے۔ "ہتھیلی پر لکھی نظمیں" میں شامل پہلی نظم میں ان کے ہاں انائی کردار جس انداز سے سامنے آیا ہے وہ شاعر کے اپنی ذاتی و انفرادی کردار کو بالآخر اجتماعیت میں معدوم کر دیتا ہے۔

توصیف تبسم انانیت کی تسکین کے لیے اپنے فکری و فنی کمال سے پوری طرح استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک ایسے سنگ سیاہ کو اپنی ذات کا استعارہ بناتے ہیں جو زیر تہہِ آب پڑا ہوا ہے اگرچہ کائی اس کو اپنی لپیٹ جانے کے باوجود خود شناسی اور خود نمائی کا کرب موجود رہتا ہے:

میرے ذہن پر، میرے جسم پر
وہ ایک گہرا نشان ہے
اسے سبز کائی نے بھر دیا
مگر ایک چادرِ آب ہے

میرے سر سے پاؤں تلک کھچی
جو گھلا رہی ہے بدن مرا[14]

ماحول کے اس جبر سے نجات کے لیے وہ انانیت کی تسکین چاہتے ہیں اور خودی کا اثبات تاکہ اس غیر انسانی صورت حال سے نجات حاصل کر سکیں۔ نظم کے آخر میں وہ اپنے فنی کمال اور صلاحیتوں کو مکمل طور پر اجالنے کی تمنا کرتے ہیں۔ وہ یوں گویا ہوتے ہیں:

کوئی راز! مجھ کو نکالتا
کوئی ہاتھ مجھ کو اجالتا
میرے نقش سارے ابھارتا
مجھے نیم رخ پہ تراشتا[15]

توصیف تبسم کی نظم میں انائی اور رجائی پہلو تواتر سے آتے ہیں۔ نظم نگار یاسیت کے گھڑے میں بے بس ہونے کے بجائے اس سے نکلنے کے اسباب تلاشتا ہے۔ توصیف تبسم کی نظم میں خود اعتمادی اور خود نمائی انائی اور رجائی پہلو کی حامل ہے۔

مایوسی اور محرومی کی صورت

وجودیت، فرد کی تنہائی کے احساسات، جذبات اور میلانات سے اعتبار قائم کرتی ہے۔ انسان زندگی کے ایک حصے میں جمالیاتی اور حسی تصویروں میں مدہوش رہتا ہے مگر جلد ہی تنہائی، بے بسی اور مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وجودی فرد ان سے نمٹنے کے لیے خود کی محدودیت سے نکل کر جستجو کرتا ہے۔ بہر حال وجودی فکر کا حامل فرد جن سوالات کو جنم دیتا ہے اُن کا سمنا کرنے کے لیے ایسے احساسات اور جذبات سامنا کرتا ہے۔ توصیف تبسم کے ہاں مایوسی اور محرومی کا تاثر اسی سبب ہے۔ نظم "شب زادگان" میں اندھیرے کی علامت سے تنہائی کا احساس ابھرتا ہے۔

مرے ساتھی، میں جن کے ساتھ ہنستا بولتا ہوں۔
مری صورت، اندھیرے میں پلے ہیں،[16]

نظم "اور ہوا کی کوئی بھی منزل نہیں" میں راستوں میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہوا کی بے سمتی مایوسی کا کرب پیدا کرتی ہے۔ نظم "آخری مکالمہ" اور "تماشا" میں وجود کی عدمیت اور عارضیت کے سبب محرومی کا احساس نمایاں ہے۔ "یہی زندگی ہے" میں زندگی کے سماجی رویوں سے محرومی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔

درج بالا تفہیم اور حوالوں کی روشنی میں توصیف تبسم کی نظم کا وجودی تناظر اُن کے منفرد اسلوب کے سبب ہے۔ مظہر ایک حقیقت ہے۔ انسان ہر اعتبار سے مظاہر سے وابستہ ہے۔ تاہم جب نظم نگار وجود اور مظہر کو متوازی سانچے میں رکھتا ہے، اس کی لفظ کاری بھی فطرت کے لغت سے سینچتا ہے تو اس سے کئی معنوی قراتیں سامنے لاتا ہے، توصیف تبسم کی نظم اس ہیئت میں فکری پہلو رکھتی ہے۔

توصیف تبسم کی نظموں کے موضوعات داخلی اظہار رکھتے ہیں۔ ایک نظم نگار اخلاقی، سیاسی، معاشی، سماجی اور تہذیبی کارروائیوں میں مقید ہوتا ہے، لیکن اس کے اظہار میں آزاد ہونا اُسے جدید نظم نگار بناتا ہے۔ توصیف تبسم کے ہاں موضوعی اعتبار سے قید و تقلید کا پہلو

نہیں بلکہ ان کے ہاں اخلاقی، سیاسی، معاشی، سماجی اور تہذیبی کارروائیوں کی فکر، مشاہدہ اور تجربہ اُن کے اپنے باطن سے جڑا ہے۔ اُن کی لفظ کاری فطرت کے استعارے اور علامت میں مکمل عکس وضع کرتی ہے۔ توصیف تبسم کی نظم داخلی قویٰ میں آزاد ہونے کے سبب مبہم نہیں ہے بلکہ یقین سے عبارت ہے۔ وجودی نظم نگار انسانی محدودیت سے نکل کر اصل وجود کی جستجو کرتا ہے۔ اس کے لیے پہلا مرحلہ جستجو اور حیرت کا ہوتا ہے۔ جب انسانی وجودی سوالوں میں الجھتا ہے، اسرار و رموز سے شناسائی کو وجود اور اس کے مظہر کو موضوع بناتا ہے جس سے اضطراب، بے چینی اور بے سکونی انسانی وجود پر اثر انداز ہوتا ہے۔ حیات کی بے ثباتی اور کون و مکان کی وسعتیں اور حیرتیں انھیں مائلِ فکر رکھتی ہیں وہ ان وسعتوں اور تحیر آمیز حقائق کا کشف چاہتے ہیں۔ وہ فکری وجدان سے ایسے مباحث نظم میں لاتے ہیں جو قاری کو جستجو، تلاش اور وجودی محدودیت کے نکلنے کا راستہ فراہم کرتے ہیں۔ یوں طبیعیاتی کے ساتھ مابعد الطبیعیاتی پہلوؤں کو موضوع بناتے ہیں۔ ان مسائل کے بیان میں اُن کا لہجہ استفہامیہ انداز اپناتا ہے جو گہری معنوی جہتیں لیے ہوئے ہے۔ کائناتی مظہر سے مساوی مطابقت سے اُن کے ہاں ایک ایسا وجود ابھرتا ہے جو فرد کی موت کو وجودی حصار سے نکل کر حیات کے تسلسل کا قائل ہے۔ ان مسائل سے ابھرنے والی الجھن اور تھکن کو بھی اُن کے فنا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نظم کے اس فکری نقطہ نظر سے اُن کے ہاں معانی کی وسعت اور گہرائی کے ساتھ ادبی مقام و مرتبہ میں بھی اس فکر کے ضمن میں انفرادی مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے فیضؔ و فرازؔ سے اس فکر ی خلا کو پورا کیا جس سے نظم میں جدیدیت کے اثرات پھر سے نمایاں ہونے لگے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔ سلطان علی شیدا: "وجودیت پر ایک تنقیدی نظر" اترپردیش اردو اکادمی، لکھنو، ۱۹۷۸ء، ص:۱۲
2۔ حیات عامر حسینی: "وجودیت" بتول پبلی کیشنز، سرینگر، اشاعت دوم، ۱۹۹۱ء، ص ۲۰
3۔ ایضاً، ص:۲۲
4۔ ناصر عباس نیّر: "جدید و مابعد جدید تنقید" انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص:۳۴
5۔ توصیف تبسم: "آسماں تہ آب" فضلی بک سپر مارکیٹ، کراچی، ۲۰۱۹ء، ص:۲۰
6۔ ایضاً، ص:۷۷
7۔ ایضاً، ص:۷۲
8۔ ایضاً، ص:۷۴
9۔ ایضاً، ص:۸۱
10۔ ایضاً، ص:۷۴
11۔ ایضاً، ص:۱۰۴
12۔ ایضاً، ص:۸۳۔۸۴
13۔ ایضاً، ص:۹۶

14۔ ایضاً، ص:۱۰۹

15۔ ایضاً

16۔ ایضاً، ص:۹۳

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Roman Havalajat

1. Sultan Ali Sheeda: “Wajodiat per aik Tanqidi Nazar” Urdu Academy, UP, India,1978,P:12
2. Hayat Amir Hussaini, Wojodiat, SeriNagar, India: Batool Publications,1991,P:20
3. As Above, P:22
4. Nasir Abbas Nayyar: “Jadeed O MabadJadeed Tanqeed”Karachi, Anjuman TraqiyUrdu 2004, P:34
5. Touseef Tabasum, Asmaan TahyAab, Krachi: Fazli book market,2019,P:20
6. Ibid, P:77
7. Ibid, P:72
8. Ibid, P:74
9. Ibid, P:81
10. Ibid, P:74
11. Ibid, P:104
12. Ibid, P:83,84
13. Ibid, P:96
14. Ibid, P:109
15. Ibid
16. Ibid, P:93